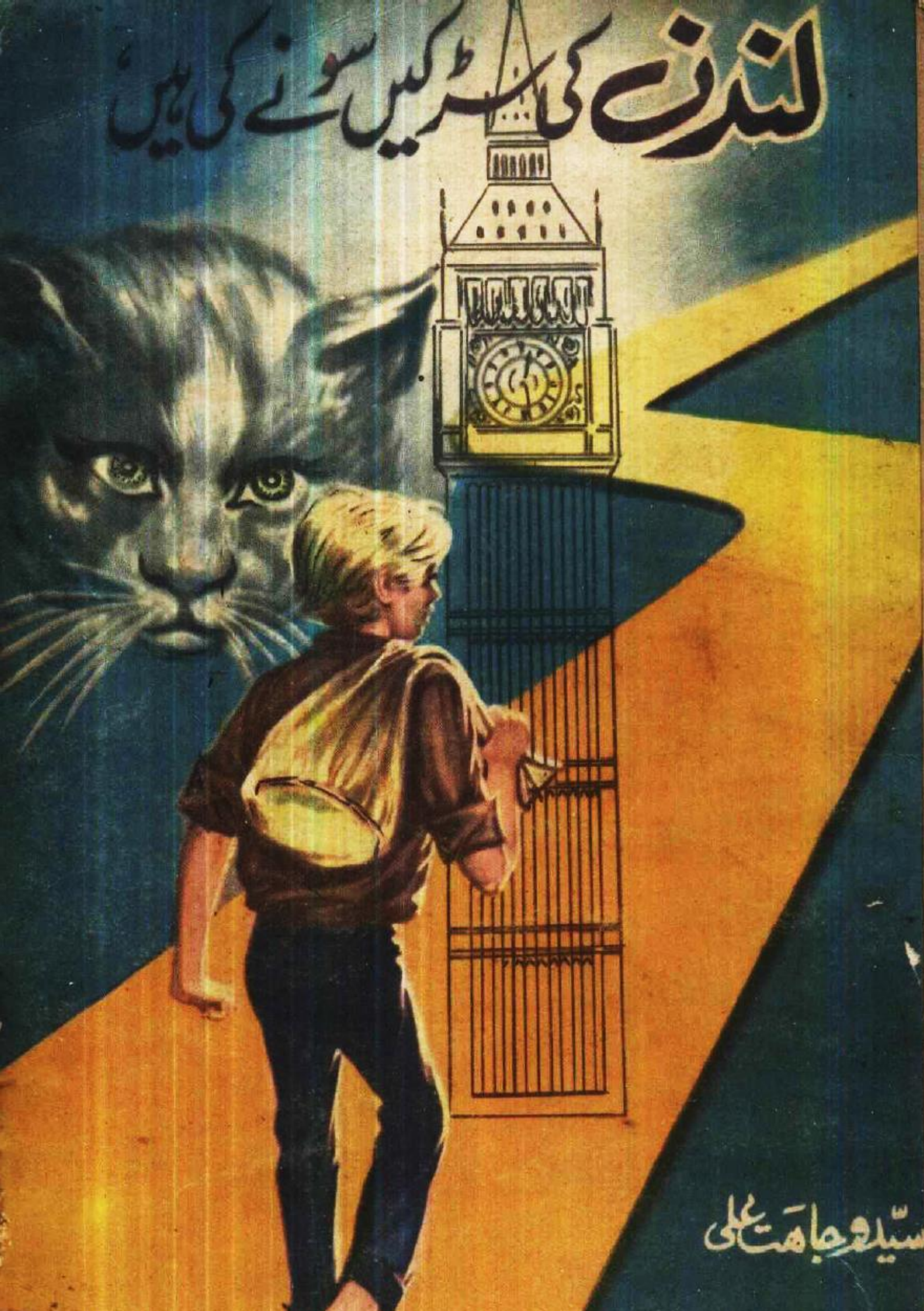

لندن کی سڑکیں سونے کی ہیں
سیّد وجاہت علی

لندن کی سڑکیں سونے کی ہیں

سید وجاہت علی

جنوری ۱۹۶۹

تعارف



اس کتاب کے مصنف ''سیّد وجاہت علی'' اب تک ۲۷ ملکوں کی سیر کر چکے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت صرف ۲۵ سال ہے۔ اس کم سنی میں انہوں نے آدھی سے زیادہ دنیا کی سیاحت کی ہے۔ اس سفر میں جہاں انہیں نئے نئے مشاہدات،

واقعات اور حادثات ملے ان کے سامنے کچھ ایسی لوک کہانیاں بھی آئیں جنہیں پڑھ کر ان دیسوں کے بچوں کی جرأت اور ہمّت بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

سیّد وجاہت علی اپنے سُتھرے پیارے انداز میں ان لوک کہانیوں کو اپنے دیس کے بچوں تک پہنچائیں گے۔

کپتان نذر حسین شاہ کے نام

جنہوں نے مجھے اس وقت جینے کا حوصلہ عطا کیا جب کہ میں جرمنی کی برفانی
سڑکوں پر بھوکا پیاسا بھٹکتا پھر رہا تھا۔

اور

اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا!

دیباچہ

آئندہ صفحات میں آپ ڈِک کی کہانی سنیں گے۔

ڈِک جو ایک معمولی سا غریب سا لڑکا تھا۔ ڈِک جو یہ بات سن کر کہ لندن کی سڑکیں سونے کی ہیں، پیدل ہی چل پڑا۔ ڈِک جو پہلے لندن کی سڑکوں پر روتا ہوا گھوما اور ڈِک جو انہی سڑکوں پر شہر کے میئر کی حیثیت سے لوگوں کے سلام قبول کرتا نکلا۔ یہ ایک ڈِک کی نہیں انسان کی ہمّت اور جرأت کی کہانی ہے جسے سیّد وجاہت علی نے اپنے مخصوص اور پیارے پیارے انداز میں لکھا۔ وہ اخباروں رسالوں میں تو زیادہ تر بڑوں کے لیے لکھتے ہیں، لیکن یہ کتاب انہوں نے آپ بچّوں کے لئے لکھی ہے۔

ڈِک بھی آپ جیسا ایک بچہ ہی تھا۔ اس کے تو والدین بہت غریب تھے، پھر وہ بچپن میں ہی گھر سے نکل پڑا۔ اسے بچپن سے ہی بے شمار مصیبتوں اور تکلیفوں کا

سامنا کرنا پڑا مگر وہ سب کا مقابلہ کرتا رہا۔ اپنی ہمّت بلند رکھی۔ قسمت نے اس کی مدد کی۔ اس کے دن پھر گئے۔ اور وہ ایک دن لندن کا میئر بن گیا۔ یہ کہانی آپ سب کی کہانی بن سکتی ہے بس ڈِک کی طرح حوصلے اور ہمّت کی ضرورت ہے۔ یہ کہانی پہلے پڑھ لیجئے کچھ ہمّت کیجیے۔ آپ کو بھی سڑکیں سونے کی نظر آئیں گی۔

محمود شام

آج سے بہت پہلے ملکہ الزبتھ اوّل کے زمانے میں سات سمندر پار انگلینڈ کے ایک گاؤں میں ایک لڑکا رہا کرتا تھا۔ گاؤں والے اس لڑکے کو "ڈِک" کہہ کر پکارتے تھے۔

اس کی قسمت شروع ہی سے کچھ عجیب و غریب تھی۔ جب یہ نو برس کا تھا تو اس کے ماں باپ ایک طاعونی وبا کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے۔ ڈِک اپنے والدین کی موت کے بعد کچھ بجھا بجھا رہنے لگا۔ وہ جب بھی اس گاؤں کی گلیوں سے گزرتا تو

لوگ اسے اس طرح اکیلا پھرتا دیکھ کر کہتے ''اُف بے چارہ ڈِک!'' لیکن کوئی اس کی مدد نہ کرتا۔

کچھ دنوں تک وہ اپنے ماں باپ کی چھوڑی ہوئی پونجی کو چاٹتا رہا، لیکن ایک دن یہ بھی ختم ہو گئی تو ڈِک نے سوچا کہ وہ اب کھائے گا کہاں سے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے ایک سفری تھیلا اپنے ماں باپ کے سامان سے تلاش کیا۔ اس تھیلے میں اس نے ایک سوکھی ڈبل روٹی رکھی اور باہر مزدوری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

ڈِک چھوٹا سا تھا۔ کمزور بھی تھا۔ ماں باپ کی موت کا غم اور اچھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے وہ حد سے زیادہ دُبلا پتلا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اس کمزور جسم کو اٹھائے جس کسی کے پاس مزدوری کرنے کے لئے ہاتھ پھیلاتا تو وہ ڈِک پر قہقہہ لگا کر کہتا۔

''تم کام کرو گے؟ ذرا اپنا جسم تو دیکھو، جاؤ جاؤ ہمارے پاس تمہارے لئے کوئی کام نہیں۔ پہلے کچھ کھاؤ پیو۔ جسم کو موٹا کرو۔ پھر ہمارے پاس آنا۔ چھوٹے ڈِک کے ننھے دِل پر یہ جملے ایک بڑا اثر ڈالتے۔ اس کا دل بیٹھ جاتا اور وہ ان لوگوں کو دیکھ کر نہ جانے کیا سوچتا لیکن ہمّت پھر بھی نہیں ہارتا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ہمّت ہار بیٹھا تو

روٹی نہیں ملے گی۔ اور جب روٹی نہیں ملے گی تو مر جاؤں گا۔ اور وہ پھر اپنے آپ ہی چیخ پڑتا۔

"نہیں نہیں، میں ابھی نہیں مروں گا۔ یہ دنیا عجائبات سے بھری پڑی ہے۔ میں اس دنیا کی تمام چیزوں کو دیکھ کر اپنے خدا کے پاس جاؤں گا۔"

ڈِک کی یہ سوچ اسے پھر گاؤں کی گلیوں میں کام کی تلاش میں دوڑا دیتی، اور وہ بیچارہ پھر گلیوں کے چکر لگانا شروع کر دیتا۔ جب کبھی تھک جاتا تو اپنے تھیلے سے نکال کر سوکھے توس کھا لیتا اور جب رات آ جاتی تو وہ اپنی تنگ سی کوٹھڑی میں آ کر پڑ جاتا جو اس کے ماں باپ اس کے سونے کے لئے چھوڑ گئے تھے۔

اور پھر ایک دن اس سفری تھیلے کے سوکھے توس بھی ختم ہونے لگے۔ ڈِک نے سوچا۔ اگر آج کام نہیں ملے گا تو میں مر جاؤں گا۔ ڈِک کا سینہ موت کے خوف سے دہل گیا اور وہ دیوانہ وار گاؤں کی گلیوں میں ایک مرتبہ پھر کام کی تلاش میں بھاگ نکلا۔

ڈِک کے سفری تھیلے میں آج صرف ایک توس تھا۔ وہ اس توس کی اہمیت کا

احساس کر کے بار بار سوچ رہا تھا کہ ”یہ توس میری آخری غذا ہے۔ اگر آج مجھے کام نہیں ملا تو یہ بھوک مجھے خود کھا جائے گی۔ نہیں نہیں، میں بھوکا نہیں مر سکتا اور اگر بھوکا مرا تو مرنے سے پہلے اپنے اس خود غرض گاؤں کو آگ لگا دوں گا۔ مجھے ان گاؤں والوں سے اب کوئی محبّت نہیں ہے۔ میں ان پر لعنت بھیجتا ہوں۔ یہ خود تو اپنے موٹے موٹے پیٹوں میں اچھی اچھی غذا بھر کے رات کو مزے کی نیند سوتے ہیں اور میں سوکھے توس کو اپنے بھوکے پیٹ میں رکھ کر رات بھر کروٹیں بدلتا ہوں۔ ہاں ہاں، اگر کام نہیں ملا تو میں رات کے اندھیروں میں اس گاؤں کو جلا دوں گا۔“

ڈِک کے ذہن میں اس قسم کے خیالات ابھر ہی رہے تھے کہ سامنے ایک چوک میں اسے کچھ آدمی کھُسر پھُسر کرتے دکھائی دیئے۔ وہ بھی چپکے سے ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور ان کی کھُسر پھُسر سننے لگا۔

ان میں سے ایک بولا:

”ارے بھائی، اس گاؤں میں دھرا ہی کیا ہے۔ گنتی کے چند کھیت اور مویشی۔ زندگی بڑی تنگ گزرتی ہے۔۔۔“

دوسرا بولا:

"یار ہمیں یہ گاؤں چھوڑ دینا چاہیے اور لندن چلا جانا چاہیے۔ سنا ہے وہاں کی سڑکیں سونے کی ہیں۔۔۔"

تیسرا بولا:

"پچھلے دنوں جان کا خط آیا تھا۔ اس نے بھی لکھا تھا کہ یہاں کی سڑکیں سونے کی بنی ہوئی ہیں۔ آؤ لندن آؤ اور دولت سمیٹو۔" تیسرے آدمی کی بات سُن کر وہ سب یک لخت بولے: "آؤ ہم سب لندن چلیں۔"

ڈِک ان چوک میں کھڑے لوگوں کی بات سن کر بہت چونکا۔ اب اس کے ننھے سے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ "لندن کی سڑکیں سونے کی ہوتی ہیں۔ اب تو میں وہیں جاؤں گا اور شاندار زندگی بسر کروں گا۔"

اب چھوٹا ڈِک اپنی اس بڑی خواہش کو لے کر اس سنسان سڑک پر اکیلا چل رہا تھا جو اس کے گاؤں سے بیسیوں میل دُور تھی۔۔۔ اس کی منزل تھی لندن۔۔۔ اور یہ منزل یہاں سے سینکڑوں کوس دُور تھی۔ اس کے اس بہت بڑے سفر میں

اس کے پاس صرف ایک سفری تھیلا تھا جس میں صرف ایک سوکھا توس تھا اور یہی سوکھا توس اس کی بھوک کا آخری علاج تھا۔

یہ اور بات ہے کہ اس کو ابھی تک بھوک نہیں لگی تھی۔ لندن جانے کی خوشی نے اس کی بھوک کو اڑا دیا تھا۔

مگر بھوک بھی بھلا کوئی اڑنے والی چیز ہے، ڈِک چلتے چلتے تھک گیا تو اس کی پیٹ کی آنتیں بولنے لگیں۔ اس نے اپنا سفری تھیلا کھول کر آخری توس نکالا اور اس پر حسرت بھری نظر ڈالی اور پھر وہ اس توس کا آدھا حصّہ اپنے پیٹ میں اتار گیا۔ آدھے ٹکڑے کو اس نے رات کی بھوک کے لئے رکھ چھوڑا۔

توس کا آدھا ٹکڑا کھانے کے بعد اسے کچھ پیاس بھی لگنے لگی۔ پانی اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ اسے اب اپنی نادانی پر ہنسی آگئی۔ رختِ سفر باندھتے وقت یہ سوچا ہی نہ تھا کہ راستے میں پیاس بھی لگے گی! اس خیال نے کہ اب پانی کہاں سے لاؤں؟ اسے بے حد پریشان کر دیا۔ اور وہ گاؤں کی طرف لوٹنے کی سوچنے لگا۔ اس گاؤں کی طرف جس کے رہنے والے اس کے حال پر تو افسوس کرتے تھے لیکن اس کو کھانے کے لئے ایک روٹی تک نہ دیتے تھے۔

لوٹنے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ پھر سوچا"اس گاؤں میں پینے کے لئے پانی تو مل جائے گا لیکن کھانے کو روٹی نہیں ملے گی۔"

"اصل چیز تو روٹی ہے"!

اسی حقیقت نے اس کے ذہن کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مرنا اس گاؤں میں بھی ہے اور مرنا اس سڑک پر بھی ہے۔ کیوں نہ آگے کی طرف بڑھتا ہوا مروں۔۔۔

ننھے ڈِک کی اس سوچ نے اسے آگے کی طرف چلا دیا۔ وہ اب چلتا جاتا تھا اور یہ خیال کرتا جاتا تھا کہ اس کی ماں اکثر اسے کہا کرتی تھی:

"ننّھے مُنّے مسافروں کی مدد تو خدا کرتا ہے۔"

اس کے چھوٹے دماغ میں پہلی مرتبہ آج خدا کا احساس ابھرا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں میں تھا تو اسے کبھی خدا یاد نہ آیا لیکن آج اس کٹھن سفر میں بار بار یاد آ رہا ہے۔"وہ یقیناً میری مدد کرے گا۔"

ابھی اس کا ذہن یہ تانے بانے بن ہی رہا تھا کہ پیچھے سے بہت سی گھنٹیاں بجنے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے بجلی کی سی تیری سے اپنی گردن کو ان آوازوں کی طرف موڑا۔ اور یہ دیکھ کر خوشی سے پھول گیا کہ آٹھ گھوڑوں سے ایک جُتی ایک بگھّی اس کی طرف بھاگی دوڑی چلی آ رہی ہے۔

وہ اس بگھّی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سڑک کے بیچوں بیچ آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے سفری تھیلے کو جس میں آدھا توس رکھا تھا، اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے فضا میں لہرانے لگا۔ اسی سفری تھیلے کو لہراتے لہراتے وہ اپنے منہ سے ”او ہو۔ اوو۔ او ہو!“ کی آوازیں بھی نکال رہا تھا۔

اور پھر وہ آٹھوں گھوڑے والی بگھّی اس کے قریب آ کر رُک گئی اور وہ ان گھوڑوں کی زد سے بچنے کے لئے اچھل کر سڑک کے ایک کنارے ہو لیا۔

بوڑھے کوچوان نے اپنا منہ ڈھکی ہوئی گھوڑا گاڑی سے باہر کی طرف نکالتے ہوئے کہا: ”میرے بچّے! تم نے مجھے کیوں روکا ہے؟ تمھیں کیا تکلیف ہے؟ کیا راستہ بھٹک گئے ہو؟“

ننھے ڈِک نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا:

”بابا! میں لندن جارہاہوں۔ تم مجھے اپنی اس خوب صورت گاڑی میں بٹھا کر لندن لے چلو۔“

بوڑھے کوچوان نے حقارت سے جواب دیا:

”اس گاڑی پر کوئی بھکاری لڑکا لندن نہیں جا سکتا۔ اس گاڑی پر تو لندن کے میئر اور لارڈ سفر کرتے ہیں اور اس سفر کی اجرت وہ ایک ہزار روپے سے بھی کہیں زیادہ دیتے ہیں۔ تم تو اگر مجھے دو ہزار روپے بھی دو تو میں تمہیں اس گاڑی پر نہیں بٹھاؤں گا۔ تمہارے یہ گندے کپڑے میری گاڑی میں بچھے نرم نرم صاف صاف بستروں کو گندا کر دیں گے۔ اتنا کہہ کر اس کوچوان نے آٹھوں گھوڑوں کو ایک ہانک لگائی۔ گھوڑے ہنہنائے اور ایک جھٹکا لے کر آگے کی طرف دوڑ گئے۔

ننّھا ڈِک ان گھوڑوں کو اپنے قریب سے دوڑتا دیکھ کر چیخا:

”بابا مجھے سردی لگ جائے گی۔ بھوک کھا جائے گی۔ میں مر جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ مجھے لندن لے چلو۔ مجھے لندن لے چلو۔“

یہ کہہ کر ڈِک زمین پر گر گیا۔

بوڑھے کوچوان کے کانوں میں جیسے ہی ڈِک کی یہ دل ہلا دینے والی آواز پڑی تو لرز اٹھا۔ اسے اس وقت اپنا ڈِک جیسا بچّہ یاد آ گیا تھا۔ وہ بچہ جو اس وقت لندن کی سردی سے بچنے کے لئے اپنے گرم مکان میں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا مزے مزے کی باتیں کر رہا ہو گا۔ اور پھر بوڑھے کوچوان کو بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے ڈِک اس کا اپنا بچّہ ہو۔

اس نے گاڑی روک دی اور بے ہوش ڈِک کو زمین سے اٹھا کر اپنی گاڑی کے نرم اور گرم بستر پر لٹا دیا۔

ڈِک کے جسم میں جونہی اس گرم بستر کی حرارت پہنچی تو وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے آواز نکالی: "میں کہاں ہوں؟"

بوڑھے کوچوان نے گردن پیچھے کی طرف کرتے ہوئے کہا:

"تم آٹھ گھوڑوں والی گاڑی میں ہو، اور اس وقت لندن کی طرف جا رہے ہو۔"

ڈِک یہ سن کر خوشی سے پھول گیا۔

بوڑھے کوچوان نے گاڑی روک دی۔ اس نے ڈِک کو انڈے کا حلوہ اور سوکھے گوشت کے ٹکڑے کھلائے۔ ڈِک کی زبان نے ان کھانوں کا مزا کافی عرصہ بعد چکھا تھا اس کی زبان ان کھانوں پر بالکل اسی طرح چپک رہی تھی جس طرح لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مقناطیس پر چلتے ہیں۔

بوڑھے کوچوان نے ڈِک کو ایک گرم کافی بھی پلائی۔ اس کافی نے ڈِک کے جسم کو قدرے گرما دیا۔ ڈِک کا چہرہ اس وقت چمک رہا تھا۔ وہ خوش خوش تھا۔

بوڑھے کوچوان نے ڈِک کو ہشاش بشاش دیکھ کر کہا:

"بیٹا تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟"

ڈِک نے ایک افسردہ سانس لیتے ہوئے کہا:

"بابا! وہ تو کب کے مر چکے ہیں۔ میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔ میرا کوئی نہیں۔ اسی لئے تو لندن جا رہا ہوں۔ وہاں سے دولت سمیٹوں گا۔ سنا ہے وہاں کی سڑکیں

سونے کی ہیں۔

بوڑھے کوچوان نے ڈِک کی یہ بات سن کر ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

”جاؤ، سو جاؤ! سفر طویل ہے۔“

اور پھر یہ گھوڑا گاڑی دوڑتی رہی۔ ڈِک بھوری آنکھوں سے باہر کی دنیا کے نظارے کرتا رہا۔ وہ اپنے اس طویل سفر میں بہت سے گاؤں سے گزرا۔ جیسے ہی اس کی آٹھ گھوڑوں والی یہ بگھّی ان گاؤں میں داخل ہوتی تو اس گاؤں کے لوگ اس کے آگے بچھ بچھ جاتے۔ اسے کھانے کے لئے مزے مزے کی ٹافیاں دیتے اور پینے کے لیے مزے مزے کے مشروب دیتے۔

ڈِک ان گاؤں والوں کی مہمان نوازی دیکھ کر سوچتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ: ”اپنے گاؤں والوں سے تو یہ غیر گاؤں کے لوگ ہی اچھے ہیں۔“ اور وہ اس طرح ان گاؤں والوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے سلام کرتا آگے کی طرف بڑھتا چلا جاتا۔

اور ایک دن یہ طویل سفر ختم ہو گیا۔ گھوڑا گاڑی لندن پہنچ چکی تھی۔ لندن پہنچ کر

ڈِک نے بوڑھے کوچوان کا شکریہ ادا کیا اور آخری مرتبہ ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہا۔ خدا حافظ کہتے وقت ڈِک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا بوڑھا دوست اس سے جدا ہو رہا تھا، وہ دوست جس نے ڈِک کو اچھے اچھے کھانے دیے تھے اور لندن تک پہنچایا تھا۔ آخر ڈِک اپنی آنکھوں میں اس بوڑھے کوچوان کی محبت میں ڈوبے آنسوؤں کو لیے لندن کی ان سڑکوں کی طرف دوڑ گیا جو سونے کی بنی ہوئی تھیں۔ لیکن اسے ایسی سڑکیں کہیں نہ ملیں۔ اس نے تنگ آ کر لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ "بھائیو! ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ یہاں وہ سڑکیں کونسی ہیں جو سونے کی بنی ہوئی ہیں۔"

کچھ نے اس کا سوال سن کر نفی میں گردن ہلا دی اور کچھ اسے پاگل تصور کر کے مسکرا دیتے اور ایک آدمی نے تو اس کے سر پر مکّا رسید کر دیا۔ اس زوردار مکّے کی چوٹ نے ڈِک کو یہ بات سمجھا دی کہ یہاں سونے کی سڑکیں نہیں ہیں۔

لیکن اب وہ غریب کرے بھی تو کیا، اسے پھر بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنے سفری میں ہاتھ ڈالا اور اس آخری سوکھے ٹکڑے کو تلاش کرنا چاہا۔ مگر وہ ٹکڑا تو نہ جانے کہاں گر گیا تھا، اب اسے زور کی بھوک ستا رہی تھی۔ اس سے رہا نہ

گیا۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے انہی لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر تانبے کے سِکّے مانگنے شروع کر دیے جن سے وہ سونے کی سڑکوں کا پتہ پوچھ رہا تھا، مگر کسی نے اس کے ہاتھ پر کچھ نہ رکھا۔ اسی اثنا میں رات آگئی اور وہ اپنے جسم کو لئے کسی ایسی جگہ کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا جہاں وہ رات گزار سکے۔ گھومتے گھومتے اسے ایک مکان کا کونہ مل گیا۔ وہ وہیں ایک طرف کو پڑ رہا۔ ڈِک تمام رات آنکھیں موندنے کی کوشش کرتا رہا مگر اسے نیند نہ آئی۔ اس نے یہ رات آنکھوں میں کاٹی اور جب صبح کے اجالوں نے اس کی آنکھوں کو چھوا تو وہ ایک مرتبہ پھر ان سڑکوں کی طرف چل نکلا، جہاں سے بجائے سونے کے کھانے کے لئے کچھ غذا مل سکے۔

ایک دن کا فاقہ کر کے وہ کمزور سا نظر آرہا تھا۔ اس سے چلا بھی نہ جاتا تھا، مگر بغیر چلے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

ایک مرتبہ پھر ڈِک لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگ رہا تھا، لیکن اسے نے کچھ نہ دیا۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چلا تھا کہ ایک بوڑھے شخص نے اسے روک کر کہا:

"بیٹا! تم کام کیوں نہیں کرتے؟"

"ملتا نہیں۔" ڈِک نے جواب دیا۔

"اچھا تو تم کام کرو گے؟" بوڑھے نے ڈِک سے کہا۔

"ملے گا تو ضرور کروں گا۔" ڈِک نے جواب دیا۔

بوڑھے نے ڈِک کا یہ فیصلہ سن کر کہا:

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ میں تمہیں کام دلاتا ہوں۔" وہ بوڑھا ڈِک کو اپنے کھیتوں پر لے گیا۔ پودوں کے گرد باڑھ بنانے کا کام اسے سونپا۔ بوڑھے نے کام سونپنے سے پہلے اسے ایک اچھا لذیذ سا کھانا دیا۔ ڈِک نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور اپنے کام پر جُت گیا۔

کام انتہائی مختصر تھا۔ شام ڈھلے ہی یہ کام ختم ہو گیا اور ڈِک اپنے ہاتھوں پر اس کام کا معاوضہ ایک شلنگ (قریباً ایک روپیہ) لیے دوبارہ ان سڑکوں پر آ گیا جہاں سے وہ اس مدّت کے دوران کئی بار گزر چکا تھا۔

اسی شلنگ میں اس نے رات کا کھانا کھایا اور سونے کی جگہ تلاش کرنے اِدھر اُدھر چلتا رہا۔

اسے اس رات بھی سونے کے لئے کسی مکان کا کونہ مل گیا۔ مگر اگلا دن اس کے لئے انتہائی کٹھن تھا۔ اس دن اسے نہ کسی نے بھیک دی اور نہ ہی کام۔

اور وہ حسب معمول اپنے بھوکے جسم کو لئے رات کے اندھیروں میں سونے کے لئے کسی مکان کا کوئی کونہ تلاش کر رہا تھا کہ یکایک اس کی ہمّت جواب دے گئی اور وہ لندن کے ایک مشہور سوداگر فیٹز وارن کے مکان کے مرکزی دروازے کی سیڑھیوں پر آکر گِر گیا۔

اس رات یہ مشہور تاجر کھانے کی ایک تقریب میں مدعو تھا۔ رات گئے جب یہ واپس لوٹا تو اپنے مکان کی سیڑھیوں پر ایک چھوٹے سے لڑکے کو یوں پڑا دیکھ کر چونک گیا۔ پہلے تو اسے حیرت ہوئی اور پھر اچانک غصّہ آیا۔ اس نے دھاڑتے ہوئے نیم مدہوش ڈِک سے کہا:

"تم یہاں کیوں لیٹے ہو۔ تم مجھے کوئی چور یا اُچکّے دکھائی دیتے ہو۔ میں ابھی تمہیں

جیل بھجواتا ہوں۔“

ڈِک نے روتے ہوئے جواب دیا:

”نہیں نہیں جناب! میں کوئی چور اُچکا نہیں ہوں اور نہ ہی بھکاری ہوں۔ میں تو کام کرنا چاہتا ہوں لیکن کوئی کام نہیں دیتا۔ میں گاؤں سے یہاں آیا ہوں۔“

سوداگر نے ڈِک کی بات سن کر کہا:

”مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں غلط سمجھا۔ اچھا اُٹھو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم کیا کام کر سکتے ہو!“

سوداگر کا یہ حکم سن کر ڈِک نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی کمزور ٹانگیں جواب دے گئیں۔ اس کی ٹانگیں ذرا اوپر کو اٹھیں، لڑکھڑائیں اور پھر سیڑھیوں پر گِر گئیں۔

لندن کے اس مشہور سوداگر نے اپنے ایک نوکر کو آواز دے کر بلایا اور کہا: ”ڈِک کو اٹھا کر اندر لے جاؤ، اسے گرم گرم کھانا اور نرم نرم بستر دو اور جب یہ

ٹھیک ہو جائے تو اسے میرے پاس لے کر آؤ۔"

دوسرے دن ڈِک اچھی نیند لینے اور اچھی خوراک کھانے کے بعد خوب چست ہو گیا۔ اس سوداگر نے ڈِک کو باورچن کے ساتھ لگا دیا۔ ڈِک دن بھر باورچی خانے کو صاف کرتا، تمام برتن دھوتا۔ اس کے علاوہ وہ سبزیاں بھی کاٹتا۔ غرضیکہ ہر وہ کام کرتا جو باورچن اسے دیتی۔ مگر یہ باورچن، ڈِک کے اس پھرتیلے پن سے خوش نہ تھی۔ وہ تمام کام کرانے کے بعد اسے سزائیں دیتی تھی۔ کبھی اس کے کان نوچتی تو کبھی اس کے بال۔ ایک دن تو اس نے حد کر دی۔ ڈِک کو ایک بید سے بہت پیٹا۔ ڈِک کے سارے بدن پر بید کی چوٹوں کے نشان لگ گئے۔ اس منظر کو یہیں کسی اور ملازمہ نے بھی دیکھ لیا۔ اور اس کی خبر سوداگر کی بیٹی ایلس کو کر دی۔

ایلس دوڑی دوڑی باورچی خانے میں آئی سارا قصّہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ درست ہے، تو پھر سوداگر کی بیٹی ایلس نے باورچن سے کہا:

"اگر آئندہ تم نے یہ حرکت کی تو یہاں سے نکال دی جاؤ گی۔"

ڈِک کی ایک مصیبت تو ٹل گئی، لیکن ایک مصیبت ابھی اور باقی تھی جو ڈِک کے لئے بڑی پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔

وہ مصیبت یہ تھی کہ ڈِک جس کمرے میں سوتا تھا وہاں چوہوں کے بل کثرت سے تھے۔ جیسے ہی رات ہوتی تو یہ ان بلوں سے نکل آتے اور ڈِک کے بستر پر دوڑ لگانا شروع کر دیتے۔ بعض چوہے تو اتنے شرارتی تھے کہ ڈِک کے جسم پر خوب کودتے پھاندتے، ان چوہوں میں ایک چوہا بہت ہی تیز تھا۔ وہ اپنی دُم ڈِک کی ناک میں ڈال دیا۔ ڈِک بے چارہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور ساری رات بیٹھا سوچتا رہتا کہ وہ ان موذیوں سے نجات کیسے پائے۔ سوچتے سوچتے اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آ گئی کہ اگر اسے کہیں سے ایک بلّی مل جائے تو وہ ان ظالموں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔

مگر صاحب بلّی آئے کہاں سے؟ ڈِک کے پاس نہ تو اتنے پیسے تھے کہ وہ بازار سے بلّی خرید لاتا اور نہ ہی کوئی دوست اس کا ایسا تھا کہ اسے بھی مفت دے دیا۔

وہ اب اسی سوچ میں پریشان سا رہنے لگا کہ ایک دن اس سوداگر کے یہاں ایک آدمی رات گزارنے آیا، جب صبح کو وہ جانے لگا تو ڈِک نے اس کے جوتوں کو

پالش کر کے چمکا دیا۔ وہ اپنے چمکے ہوئے بوٹوں کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا اور اس نے ڈِک کے ہاتھوں پر تانبے کا ایک پنس (پیسہ) رکھ دیا۔ ڈِک نے اس چمکتے ہوئے پیسے کو اپنے ہاتھ پر رکھ کر اچھالا اور خوش ہو گیا کہ وہ اس پیسے سے ایک بلّی خریدے گا، اگر بلّی زیادہ قیمت کی ہوئی تو وہ اس پیسے کو دے کر بقیہ رقم کی کچھ قسطیں مقرّر کروائے گا اور ہر مرتبہ جب جب سوداگر کے یہاں آدمی رات گزارنے آتے رہیں وہ ان کے جوتوں کو چمکاتا رہے گا اور چمکتے تانبے کے سِکّے حاصل کرتا رہے گا، اور اپنی ادھار کی قسطوں کو اتارتا رہے گا۔

اس خیال نے ڈِک کو دیوانہ بنا دیا تھا۔

دوسری صبح ڈِک بلّی کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ آخر کار اسے ایک عورت نظر آئی جس کے ہاتھوں میں ایک بڑی کالی اور سفید بلّی تھی۔ وہ دوڑا دوڑا اس عورت کے پاس گیا اور دریافت کیا:

"کیا آپ اپنی یہ بلّی فروخت کرنا پسند کریں گی؟"

اس عورت نے مسکراتے ہوئے کہا: "ہاں!" ڈِک نے خوش ہو کر اس عورت کے

ہاتھ میں چمکتا ہوا پیسہ رکھ کر کہا: ”یہ لو اس کی رقم اور لاؤ مجھے بلّی دو۔“

عورت نے ڈِک کا تانے کا سکہ لوٹاتے ہوئے کہا:

”میری بلّی بہت قیمتی ہے، یہ تو چوہوں کا خوب شکار کرتی ہے۔ نا بابا نا، میں اپنی بلّی اتنے سستے داموں میں نہیں دے سکتی۔“

ڈِک نے اس عورت کا فیصلہ سن کر اپنا منہ لٹکا لیا اور بجھے دل کے ساتھ گھر کی طرف واپس جانے لگا۔ اس عورت کا دل ڈِک کو اس طرح افسردہ اور بجھا بجھا دیکھ کر پسیج گیا۔ اس نے ڈِک کو بلاتے ہوئے کہا:

”اچھا لاؤ مجھے پیسہ دو اور بلّی لو۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ اس بلّی کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔“

ڈِک خوشی سے ناچتا اچھلتا خوب صورت بلّی کو اٹھائے اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔

وہ اب بے انتہا خوش تھا۔ اس کی بلّی نے آتے ہی چوہوں کا شکار کیا اور بعض

چوہے اس کے ڈر سے بھاگ گئے۔

اب تو ڈِک کی راتیں اطمینان سے گزرنے لگیں۔

ڈِک جس سوداگر کے ہاں ملازم تھا اس سوداگر کے پانی کے کئی جہاز تھے جو دوسرے ملکوں سے تجارت کرنے ہر سال لندن سے باہر جاتے تھے اور وہاں اپنا تجارتی سامان فروخت کر کے کافی دولت سمیٹ کر لندن واپس آتے تھے۔ جب یہ جہاز لندن سے دوسرے کی طرف جاتے تو یہ سوداگر اپنے تمام ملازموں کو بلاتا اور ان سے پوچھتا کہ وہ لوگ جو چیز میں بھی تجارت کے لئے دینا چاہتے ہیں وہ جہاز کے کپتان کے حوالے کر دیں۔ جہاز کا کپتان ملازموں کے سامان کو سوداگر کے سامان کے ہمراہ لے جاتا اور جب یہ سامان بک جاتا تو وہ یہ رقم سوداگر کے حوالے کر دیتا۔ سوداگر اپنے ملازموں کے سامان سے حاصل کی ہوئی رقم کو ایک بڑے منافع کے ساتھ واپس کرتا۔ اس طرح سے سوداگر کے تمام ملازم خوب نفع کماتے تھے اور بعض تو بہت امیر ہو گئے تھے۔

ڈِک کو بلّی لائے ہوئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک تجارتی جہاز کی روانگی کا وقت آ گیا۔ سوداگر نے اپنے تمام ملازموں کو بندر گاہ پر بلا کر کہا کہ وہ جو چیز

تجارت کے لئے دینا چاہتے ہیں دے دیں۔ تمام ملازموں نے سوداگر نے حکم کی تعمیل کی اور جہاز کے کپتان کو اپنا اپنا سامان دے دیا۔

مگر سوداگر یہ دیکھ کر چونک گیا کہ ڈِک ان لوگوں میں موجود نہیں، اس نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔ ”ڈِک یہاں کیوں نہیں ہے؟“

سوداگر کی بیٹی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈِک یہاں کیوں نہیں ہے۔ سوداگر کی بیٹی نے باورچن کو بلاتے ہوئے کہا: ”جاؤ ڈِک کو بُلالاؤ۔“

جیسے ہی باورچن کے ہمراہ ڈِک بندر گاہ پر آیا تو سوداگر کی لڑکی نے اسے کچھ سامان دینا چاہا لیکن سوداگر نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا:

”اس تجارت میں ہر ملازم کا اپنا سامان فروخت ہوتا ہے تو یہ میرا اصول ہے۔“

ڈِک نے سوداگر کی بات سن کر کہا:

”میرے پاس دھرا ہی کیا ہے، سوائے اس بلّی کے۔“

ڈِک کا یہ جملہ سن کر بندر گاہ پر کھڑے تمام ملازموں نے ایک قہقہہ لگایا اور ایک

دوسرے سے کہنے لگے کہ بھلا بلّی بھی کوئی ایسی شے ہے جو اس جہاز پر تجارت کے لئے روانہ کی جائے۔

مگر سوداگر نے ڈِک کو یہ حکم دیا کہ ”اپنی اس بلّی کو جہاز پر چڑھا دو۔“

بلّی کو جہاز پر چڑھا کر ڈِک کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے گئے۔ سوداگر کی بیٹی نے ان آنسوؤں کو اپنے رومال سے پونچھتے ہوئے ڈِک سے کہا:

”تم کوئی غم نہ کرو۔ میں تمہیں اتنی رقم دے دوں گی کہ تم اس سے ایک اور نئ بلّی خرید سکو گے۔“

لیکن سوداگر کی بیٹی کے اس رحم دل برتاؤ کو دیکھ کر وہ باورچن اور جل گئی اور اس نے دل میں یہ تہیّہ کر لیا کہ وہ ڈِک کو اور ستائے گی۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔

وہ ڈِک کو حد سے زیادہ تنگ کرنے لگی۔ ایک دن باورچن نے ڈِک کو بہت پٹیا اور اسے کھانے کے لئے بھی کچھ نہ دیا یہ اب وہ ڈِک کو مسلسل فاقہ دینے لگی۔ ایک صبح تو ڈِک کی ہمّت جواب دے گئی۔ اس نے اپنے چند پھٹے پرانے کپڑے سمیٹے اور اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اس کے کانوں میں بڑے چرچ کی بڑی گھنٹی کی یہ آواز پڑی:

لوٹ آؤ ڈِک ٹانگ ٹن ٹیئر

تین بار تم بنو گے لندن کے میئر

اور پھر وہ یہ سوچ کر لوٹ پڑا کہ میں تو تین مرتبہ لندن کا میئر بنوں گا۔ اس خیال نے اسے یہ احساس دلا دیا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ اپنی زندگی اپنے بے آسرا اور بے گھر عوام کے لئے وقف کر دے گا۔ اور ہاں میئر بننے کے بعد وہ اس شیطان باورچن کے کان بھی نوچے گا اور وہ یہ سوچ کر دوبارہ پھر اس ظالم باورچن کے آنے سے پہلے باورچی خانہ میں داخل ہو چکا تھا۔

اِدھر ڈِک اپنی زندگی کو اس باورچی خانے میں گزارتا رہا، اُدھر سوداگر کا جہاز کئی ایک طوفانوں سے گزرتا، اپنے اندر لاکھوں من سامان رکھے اور ڈک کی بلّی کو اٹھائے ایک ایسے جزیرے سے جالگا جہاں کالے حبشی رہتے تھے۔

ان لوگوں نے جہاز کو کوئی نقصان نہ پہنچایا بلکہ عملے کے ساتھ انتہائی نرمی اور

اخلاق سے پیش آئے۔ کپتان نے یہاں کے لوگوں کا اخلاق دیکھ کر یہ اندازہ لگالیا کہ وہ اس کے جہاز کا سارا سامان خرید لیں گے۔ کپتان اس خیال سے خوش ہو گیا تھا۔ اس نے ان آدمیوں کو بلاتے ہوئے، اپنے جہاز کے سامان میں سے کچھ تحائف بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیے۔ جیسے ہی یہ تحفے بادشاہ کو ملے تو وہ خوش ہو گیا اور اس نے کپتان کو کہلا بھیجا کہ وہ شام کا کھانا میرے ساتھ کھائے۔

بادشاہ کی یہ دعوت کپتان کے لئے بڑا اعزاز تھی۔ شام ہوتے ہی کپتان خوشی خوشی محل کی طرف گیا۔ جونہی کپتان محل میں داخل ہوا اس کی آنکھیں مارتے حیرت کے پھیل گئیں۔

دربار کے تمام امرا، خوب صورت قالینوں پر اس کے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ ایک کونے میں ایک تخت پر جلوہ انداز تھا۔ تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد بادشاہ نے ملازموں کو دربار میں کھانا لگانے کو کہا۔

بادشاہ کا حکم ملتے ہی اس کے ملازم کھانا لینے لپکے اور دربار میں کھانا لگا دیا۔

اس سے پہلے کہ کپتان درباریوں سمیت کھانے میں ہاتھ ڈالے، چاروں طرف سے موٹے موٹے چوہے نکل آئے جو آناً فاناً ان کھانوں پر پل پڑے اور چند لمحوں میں سارا کھانا چٹ کر گئے۔ کپتان نے یہ صورت حال دیکھ کر بادشاہ سے کہا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

بادشاہ نے جواب دیا کہ:

”یہاں ہر روز ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ چوہے کھانا ہی نہیں کھانے دیتے اور نہ کسی آدمی سے ڈرتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ان ظالموں سے نجات کیسے حاصل کریں۔ اور ہاں ہم نے تو ان بدبختوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک بڑا انعام مقرر کر رکھا ہے۔“

کپتان نے جیسے ہی بادشاہ کے یہ الفاظ سنے تو فوراً اس کا ذہن ڈِک کی بلّی کی طرف دوڑ گیا جو اس وقت جہاز میں بیٹھی جانے کیا کر رہی تھی۔

کپتان نے کہا:

”میرے پاس اس مصیبت کا ایک علاج ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ

میں ان چوہوں سے آپ کو ہمیشہ کے لئے نجات دِلا دوں گا۔"

بادشاہ نے کپتان کی بات سن کر کہا:

"اگر آپ واقعی ہمیں ان موذی چوہوں سے نجات دلا دیں تو ہم آپ کو مالا مال کر دیں گے اور جہاز کا سارا سامان بھی خرید لیں گے۔"

کپتان بادشاہ کی اتنی بڑی پیش کش کو سن کر جہاز کی طرف بھاگ پڑا اور پلک جھپکتے ہی اپنے ہاتھوں میں ڈِک کی خوب صورت اور بہت پیاری کالی سفید بلّی لئے چلا آیا۔ بادشاہ اور ملکہ نے ڈِک کی اس خوب صورت بلّی کو دیکھا تو آپ ہی آپ ہنس دیے۔ نہ جانے کیوں۔

اتنے میں کھانا دوبارہ لگایا جا چکا تھا۔ کھانے کے لگتے ہی چوہے کھانوں کی طرف لپکے۔ ڈِک کی اس بلّی نے جو اتنے بہت سارے چوہوں کو دیکھا تو کپتان کی گود سے چھلانگ لگا کر ان پر جھپٹ پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بہت سارے چوہوں کو مار ڈالا اور باقی چوہے بلّی کے ڈر سے بھاگ گئے۔

ملکہ اور بادشاہ اس منظر کو دیکھ کر پھڑک اٹھے۔ ملکہ نے بے تاب ہوتے ہوئے

کپتان سے کہا:

"کیا یہ بلّی ہمیں مل سکتی ہے؟"

کپتان نے ملکہ کو خوش کرنے کے لئے بلّی کو ملکہ کی گود میں ڈال دیا۔ بلّی ملکہ کی گود میں جاتے ہی سو کر خرّاٹے لینے لگی۔

کپتان کا وعدہ پورا ہو گیا تھا۔ ملکہ اور بادشاہ نے جہاز کا سارا سامان خرید لیا اور سامان کی اصل قیمت سے دس گنا زیادہ رقم کپتان کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

"یہ نو گنا زیادہ رقم ڈِک کی بلّی کی ہے۔"

کئی سالوں بعد کپتان اتنی ساری دولت سمیٹ کر صحیح سلامت لندن پہنچ گیا۔ دوسری صبح کپتان سوداگر کے دفتر پہنچا۔ سوداگر اس وقت اپنے کچھ ضروری کاغذات دیکھنے میں مصروف تھا کہ اس دوران ہی کپتان نے سوداگر کے دفتر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

سوداگر نے آواز دی: "کون ہے؟"

کپتان نے کہا: ”کیپٹن اسمتھ۔“

سوداگر نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ مگر سوداگر یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ کپتان کے ساتھ بہت سے ملّاح بھی کھڑے ہوئے ہیں جن کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تھیلے ہیں۔

سوداگر نے کپتان سے پوچھا:

”ان تھیلوں میں کیا ہے؟“

کپتان نے جواب دیا:

”ڈِک کے لئے تحائف اور وہ رقم جو اس کی بلّی کے عوض ملی۔“ اور پھر کپتان نے سوداگر کو ساری رام کہانی سنائی۔ سوداگر مسٹر فیٹز وارن نے ایک نوکر کے ہاتھ فوراً ڈِک کو بُلا بھیجا۔

ڈِک اس وقت باورچی خانے میں برتن مانجھ رہا تھا کہ اسے سوداگر کا بلاوا ملا۔ اس نے لڑکے سے کہا:

"میں ذرا اُجلے کپڑے پہن لوں تو چلتا ہوں۔" لیکن نوکر نے ایک نہ سنی اور کہا:
"اسی حالت چلو۔"

ڈِک اس نوکر کے ہمراہ سوداگر کے دفتر پہنچا۔ سوداگر نے ڈِک کو کرسی پیش کرتے ہوئے کہا:

"جناب والا تشریف رکھیے۔"

ڈِک سوداگر کا یہ رویہ دیکھ کر سوچنے لگا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یقیناً مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ وہ ڈرتے کرسی پر بیٹھ گیا۔

سوداگر نے ڈِک کی کمزوری محسوس کرتے ہوئے کہا:

"آپ میری طرح امیر ہو گئے ہیں۔"

ڈِک سوداگر کا یہ جملہ سن کر پہلے سے کہیں زیادہ پریشان ہو گیا، مگر جب اس کو تمام قصّہ سنایا تو اس پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ اور جب کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو کہنے لگا:

”میرے آقا! یہ سب آپ کی بدولت ہوا ہے۔ آپ اس میں سے آدھی رقم لے لیجئے۔“

لیکن سوداگر نے انکار کر دیا کہ ”یہ رقم صرف تمہاری ہے۔“

اتنے میں سوداگر کی بیٹی بھی وہیں پہنچ گئی۔ ڈِک نے اسے دیکھتے ہوئے کہا کہ ”آپ نے میرے بہت سے آنسو پونچھے تھے۔ آپ ہی اس میں سے کچھ لے لیجیے۔“

سوداگر کی بیٹی نے بھی انکار کر دیا۔

کپتان نے ڈِک کی یہ حالت دیکھتے ہوئے کہا: ”مسٹر ڈِک یہ رقم صرف آپ کی ہے۔ آپ کام میں لائیے اور عیش اڑائیے۔“

سوداگر نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ وہ ڈِک کو کسی اچھے کپڑوں کی دکان پر لے جائیں اور اس کو کوئی اچھا سا سوٹ پہنا کر لے آئیں۔

اور جب ڈِک خوب صورت کپڑوں میں ملبوس ہو کر دوبارہ سوداگر کے سامنے آیا

تو وہ ایک خوب صورت و خوبرو لڑکا لگ رہا تھا۔

ڈِک نے سوداگر سے اپنی دولت لی۔ پہلے تو اس نے اس دولت میں سے کچھ حصّے جہاز کے ملّاحوں میں تقسیم کیئے۔ اس کے بعد کچھ رقم اس باورچن کو دی جو اس کے کان کھینچا کرتی تھی۔ اس کے بعد اس نے اس دولت سے لندن میں تجارت شروع کر دی۔ اس کی تجارت خوب چمکی اور وہ لندن کا امیر ترین نوجوان بن گیا۔ دِن گزرتے رہے اور ایک دن ڈِک نے اس سوداگر کی جوان اور خوب صورت لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس کی شادی کی تقریب میں لندن کے دوسرے معزّزین کے علاوہ لندن کے میئر نے بھی شرکت کی۔

ڈِک کی شادی میں لندن کے میئر کی شرکت ڈِک کے لئے ایک بڑا اعزاز تھی۔ جب اس کی نگاہیں اس تقریب میں لندن کے میئر پر پڑیں تو اس کا ذہن اپنے ماضی کی طرف لوٹ پڑا۔ اس ماضی کی طرف جب وہ لندن کی گلیوں میں بھوک سے تڑپتا پھر رہا تھا۔ وہ لوگوں کے چمکتے دمکتے چہرے دیکھتا، ان سے بھیک مانگتا۔ مگر اس کی کوئی نہ سنتا۔ وہ اپنی اس ننّھی سی جان کو لیے، لندن کی سردی سے خود کو محفوظ کرنے کے لئے اِدھر اُدھر مکانوں کے کونے تلاش کرتا پھرتا۔ وہ نہ

جانے اور کیا کچھ سوچتا کہ لندن کے میئر نے سامنے آکر ڈِک سے کہا:

"مسٹر ڈِک، آپ کی شادی میں تو لندن کے سارے معزّز آئے ہوئے ہیں۔ آج کی تقریب کم از کم ہم سب کو یہ بتا رہی ہے کہ آپ ایک دن لندن کے میئر ضرور بنیں گے۔"

میئر کی زبان سے ڈِک کے کانوں میں جب یہ الفاظ پڑے کہ تم ایک نہ ایک دن لندن کے میئر ضرور بنو گے، تو اسے بڑے چرچ کی وہ گھنٹی یاد آ گئی جس نے ڈِک کو ایک مرتبہ یہ کہہ کر باورچی خانے میں واپس بلا لیا تھا:

لوٹ آؤ ڈِک ٹانگ ٹن ٹیئر

تین بار تم بنو گے لندن کے میئر

اس گھنٹی کے ساتھ ساتھ اسے آج وہ ظالم باورچن بھی یاد آ گئی جو اس کے بال نوچا کرتی تھی، مگر اب وہی باورچن ہر روز صبح صبح ڈِک کو کافی اور انڈے کا حلوہ دیتی اور آج کی تقریب کے سارے کھانے بھی اسی باورچن نے بنائے ہیں۔ غرضیکہ یہ تقریب بھی جوں توں کر کے ختم ہوئی۔ لیکن ڈِک کی زندگی ہر روز بہتر سے

بہتر ہوتی رہی۔ وہ اپنی تجارت کو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھاتا رہا۔ لوگ اب اسے لندن کا معروف ترین تاجر کہنے لگے۔ وہ اب بہت ہی خوش تھا، لیکن جب کبھی وہ تنہائی میں بیٹھا کسی بلّی کو اپنے سامنے دوڑتا دیکھتا تو اسے وہ بلّی یاد آجاتی جس نے ڈِک کی زندگی کو یہاں تک پہنچایا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے، صرف یہ سوچ کر کہ اس کی وہ پیاری بلّی جانے کب کی مر کھپ گئی ہو گی۔

ایک دن اسی سوچ میں لندن کی سڑکوں سے گزر رہا تھا کہ یکایک بہت تیز ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں، اتنی تیز کہ ڈِک کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان ہواؤں نے قیامت ڈھانا شروع کر دی۔ ان طوفانی ہواؤں نے بہت سے اچھے اچھے پکے مکانات گرا دیے۔ چاروں طرف سے ایک شور اٹھ رہا تھا:

”بچاؤ بچاؤ، ہائے میرا بچہ۔ ارے یہ کیسی قیامت ہے؟“

ڈِک نے بھی اپنے بچاؤ کے لئے میدانی علاقے کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ ابھی وہ گلی کے ایک کونے کی طرف سے گزر رہی رہا تھا کہ اس کے دائیں طرف ایک مکان گرا۔ اس مکان سے ایک بڑھیا کے چیخنے کی آواز آئی۔ ڈِک اس مکان کے ملبے میں گھس گیا اور اس بڑھیا کو نکال لایا جس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں۔

ڈِک اس بڑھیا کو فوراً ہسپتال لے گیا جہاں اس کے علاج کا بندوبست کیا۔ اس طوفان نے لندن کے اور علاقوں میں بھی تباہی مچائی۔ بہت سے مکانات جیتے جاگتے انسانوں پر گِر گئے۔ ایک ہزار انسان اپنے بازوں اور ٹانگوں سے محروم ہو گئے۔

ڈِک نے پورے لندن میں اعلان کرا دیا کہ وہ ان ٹوٹی ہوئی ٹانگوں اور بازوؤں والے انسانوں کا علاج کرے گا اور ان ضائع شدہ ٹانگوں کی بجائے لکڑی کی خوب صورت ٹانگیں لگوا دے گا۔

اور ہوا بھی ایسا ہی کہ ڈِک نے نہ صرف ان تمام ٹوٹی ہوئی ٹانگوں والوں کو لکڑی کی ٹانگیں لگوائیں بلکہ ان کے مکانات نئے سرے سے تعمیر کرا دیے۔ یہ لوگ بہت ہی خوش تھے اور جب کبھی یہ لوگ لکڑی کی ٹانگوں پر چلتے ہوئے لندن کی گلیوں سے گزرتے تو لوگ ان لکڑی کی ٹانگوں والوں کو دیکھ کر یہ سمجھ جاتے کہ اچھے ڈِک نے ان کو یہ نئی نئی ٹانگیں دی ہیں۔ اس طرح یہ لکڑی کی ٹانگوں والے انسان ڈِک کے لئے نیک نامی کا ایک بڑا ذریعہ بن گئے۔ لندن کے لوگ اب ڈِک سے پیار کرنے لگے تھے اور پھر اسی دوران لکڑی کی ٹانگوں والی ایک بڑھیا نے یہ

تجویز لندن کے عوام کے سامنے رکھی کہ ڈِک کو لندن کا میئر ہونا چاہیے۔ اس بڑھیا کی آواز جو نہی لندن کی عوام تک پہنچی تو انہوں نے اس آواز کو اپنی آواز بنا لیا۔ اور اس طرح وہ تین مرتبہ متواتر لندن کا میئر بنا۔

ڈِک نے اپنی تجارت کو اور وسیع کیا۔ اب اس کے نام کا سِکّہ لندن میں خوب چمکنے لگا۔ ملکہ اس کی شہرت اور خدمت سے بہت ہی متاثر ہوئی۔ اس نے ڈِک کو سر رچرڈ کا خطاب دیا۔

اس زمانے میں ڈِک نے لندن میں ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کرائی۔ اس عمارت کو اس نے ان لوگوں کے لئے وقف کر دیا جن کے پاس نہ کھانے کو پیسہ، نہ پہننے کو کپڑا اور رہنے کو جگہ تھی۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ڈِک کی بیوی فوت ہو گئی اور پھر کچھ مدّت بعد ڈِک کا آخری وقت بھی قریب آ گیا۔ ڈِک نے مرنے سے پہلے اپنے تمام دوستوں کو بلایا اور کہا: ”مجھے آج بھی بڑے چرچ کی وہ گھنٹی یاد آ رہی ہے جس نے مجھے تین مرتبہ میئر بننے کا یقین دلایا تھا۔ اس وقت میں ایک غریب لڑکا تھا۔ میں اس چرچ کی اس گھنٹی کی آواز کو کبھی نہیں بھول سکتا، اور ہاں میرے دوستو! میرے مرنے کے بعد تم میری رقم کو اسی عمارت پر

خرچ کرنا، جہاں یتیم اور بے آسرا اور دکھیارے لوگ رہتے ہیں۔"

ڈِک یہ آخری الفاظ ادا کرتے ہی اپنے خدا سے جاملا۔

ڈِک کی کوئی اولاد نہ تھی۔ڈِک کی بنائی ہوئی یہ عمارت آج تک موجود ہے۔لندن کے غریب عوام جو آج ایک اچھی زندگی گزار رہے ہیں آج بھی ڈِک کا احترام اسی طرح کرتے ہیں جیسے پہلے کرتے تھے، اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک اس عمارت کی ایک اینٹ بھی باقی ہے۔

